دل دماغ سب اس دولت مند آدمی کے آگے جھکے رہے، اے کاش اس ذہنی غلامی کا ہمارے پیرادر پیرزادوں کو احساس ہو۔

اس سلسلہ میں خود شاہ تونسویؒ کا ایک دلچسپ واقعہ سننے کے لائق ہے، لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ نواب محمد صادق خاں نے خواجہ مہاروی ؒ کے صاحبزادوں سے جرمانہ وصول کیا، شاہ تونسویؒ کو خبر ہوتی تو بڑا صدمہ ہوا، اور نواب صاحب سے خط وکتابت بند کردی، نواب صاحب کو اس کا احساس ہوا، تو انھوں نے کچھ لوگوں کو معافی کی درخواست لے کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اتفاق سے خواجہ مہارویؒ کے صاحبزادے بھی موجود تھے، ان کو بھی اس وفد کے ساتھ کر دیا، چنانچہ صاحبزادے نور احمد صاحب وفد کے ساتھ خواجہ تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے نواب صاحب کے یہاں چلنے کی درخواست کی۔ پہلے تو ٹالا۔ مگر جب صاحبزادے صاحب کا اصرار ہوا تو فرمانے لگے

"صاحبزادے صاحب آپ کو اس کام کے لئے یہاں تشریف لانا ہرگز ہرگز مناسب نہ تھا، آپ کی خاطر تو میں نواب صاحب سے ناراض ہوا تھا، . . . . اب آپ ہی خود تشریف لائے ہیں ——— صاحبزادہ صاحب نے جواب دیا، قبلہ کیا کریں مجبور ولاچار ہو کر آئے ہیں۔ ہماری گذران اس ملک میں ہے ——— خواجہ صاحبؒ نے فرمایا نہیں نہیں۔ وہ تمہارے ملک میں ہے اور اس کی گذران تمہارے ملک میں ہے، خداوند کریم کا بھی لحاظ چاہئے، آپ کے والد صاحب قطب الاقطاب تھے، آپ خدا کے دروازہ کو چھوڑ کر اہلِ دنیا کے پاس التجا لے جاتے ہیں؟"[1]

موجودہ دور کے سجادہ نشین حضرات اس واقعہ کو غور سے پڑھیں اور اگر کوئی بھولا ہوا سبق یاد آجائے تو دعائیں دیں ——— اور پھر اپنے کو پہچانیں، دولت پرستی کسی بھی پیراور پیرزادہ کو زیب نہیں دیتی۔

؎ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل   اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور بڑی اصلاح فرمائی، ۷ صفر ۱۲۶۷ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے ایک خلیفہ حافظ محمد علی صاحبؒ کا واقعہ ہے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۵۹۵

"ایک مرتبہ حیدرآباد میں حضرت شاہ یوسف کے مزار پر حاضری کا اتفاق ہوا، تو دیکھا کہ وہاں طوائفوں کا ناچ ہو رہا ہے، آپ کو اس قدر غصہ آیا، کہ محفل میں پہنچ کر مشائخ کو للکارا ——— یہ بال تمہاری ڈاڑھی کے نہیں ہیں۔ بلکہ زنار کے تار ہیں، اولیاء اللہ کے مزاروں پر ایسا فسق و فجور ہوتا ہے، اور تم دیکھتے ہو!"[1] دینی حمیت و غیرت اسی کا نام ہے، منکر پر خاموشی پسند نہیں فرمائی گئی، بلکہ علی الاعلان دیکھنے والوں کو ڈانٹا گیا، اس حق گوئی کی اس دور میں بڑی ضرورت ہے۔ سننے میں آیا ہے یوپی کے بعض مزارات پر آج بھی یہی رسمِ قبیح انجام دی جاتی ہے۔ جو پیرزادے اس میں مبتلا ہیں ان کو توبہ کرنا چاہیے، اور پھر آئندہ سے پرہیز اور اجتناب کا عزم بالجزم۔

لہ تاریخ مشائخ چشت ص۶۷۲

تفسیر مظہری عربی

علماء طلباء اور عربی مدرسوں کے لئے شاندار تحفہ

مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے "تفسیرِ مظہری" تفسیر کی تمام کتابوں میں بہترین سمجھی گئی ہے۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنی مثال نہیں رکھتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس عظیم الشان تفسیر کے بعد کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی، امام وقت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات کا یہ عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس بے مثال کتاب کا پورے ملک میں ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔ شکر ہے کہ برسوں کی جدوجہد کے بعد آج ہم اس لائق ہیں کہ اس متبرک کتاب کے شایع ہونے کا اعلان کر سکیں تمام جلدیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد: — جلد اول سات روپے۔ جلد ثانی سات روپے۔ جلد ثالث آٹھ روپے۔ جلد رابع پانچ روپے۔ جلد خامس سات روپے۔ جلد سادس آٹھ روپے جلد سابع آٹھ روپے۔ جلد ثامن آٹھ روپے جلد تاسع پانچ روپے۔ جلد عاشر پانچ روپے۔ ہدیہ کامل ۱۰ جلد ۷۸ اٹھہتر روپے۔ رعایتی ساٹھ روپے۔

منیجر: — مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

عہدِ مصحفی کے ادبی رجحانات

(۱)

(جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی ریڈر دہلی یونیورسٹی دہلی)

مصحفی نے تین تذکرے لکھے ہیں : تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا اور عقد ثریا۔ ید بیضا اور گلزار جو مشیر احمد صاحب علوی نے دریافت کی ہیں، قطعی طور پر جعلی کتابیں ہیں۔

تذکروں پر جو اعتراضات عمومی طور پر کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) "جانب داری اُن کا شعار تھا اور خودستائی اُن کا مقصود"۔

(۲) اِن تذکروں میں تحقیق و تنقید نہیں، محض انتخابِ کلام ہے۔

(۳) اِن کی تدوین میں تاریخ نگاری کے اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔

(۴) اِن سے شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور نشیب و فراز کا اندازہ نہیں ہوتا۔

(۵) اِن میں نقل در نقل ہے اور بعض صورتوں میں ماخذ کا ذکر نہیں ہوتا"۔

یہ اعتراضات صرف ایک حد تک صحیح ہیں، لیکن زیادہ تر ان تذکروں سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ ان کو پڑھتے وقت ہمیں اس دور اور عہد کے اصولِ تذکرہ نگاری پر نظر رکھنا چاہیے۔ اور ساتھ ہی، یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مشرق اور مغرب میں کس قسم کا اختلافِ مذاق، فطری طور پر موجود ہے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک کے ادب کو اس کی تاریخیت سے قطع نظر کرکے، ایک ہی فیتے سے ناپنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

تذکرہ، فنِ سیرت کی ایک شاخ ہے۔ لیکن فنِ سیرت نہیں۔ اس لئے اس میں ایجاز و اختصار کا ہونا لازمی ہے۔ اس زمانے کے لکھنے والے زیادہ تر پُرمعنی واقعات ہی کو پیش کرتے تھے اور شاعر کی تصویر محض چند لکیروں سے کھینچتے تھے۔ اس کے علاوہ مشرق کا ایک اصول (اچھا، یا بُرا ابھی اس سے بحث نہیں) یہ بھی تھا کہ "محتسب را درونِ خانہ چہ کار"! وہ بزرگوں کی عیب جوئی کو حتی الوسع

ناپسند کرتے تھے اور سیرت نگاری کا موجودہ نظریہ "طشت از بام افگندن" اُن کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ مغرب میں بھی عہدِ وکٹوریہ تک "سرایں شیشہ فرو بند" کے اصول پر عمل رہا ہے۔ لوگ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ بائرن کے نجی خطوط شائع کئے جائیں۔ ٹینی سن نے اسی لئے خفا ہو کر کہا تھا کہ "پبلک کو بائرن کی آشفتہ مزاجیوں اور بے راہ رویوں کے جاننے کا کیا حق ہے۔ اس نے دنیا کو پاکیزہ کلام اور افکارِ نغز دیئے ہیں اہلِ دنیا کو اسی سے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اور بس"

مجھے حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ مصحفی نے ان پابندیوں کے باوجود اپنے تذکروں میں کس طرح بے مثل معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ اُن سے ریزہ چینی آسان نہیں ہے۔ بڑی محنت اور بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہم یہ محنت گوارا کر لیں تو مصحفی اور عہدِ مصحفی کا ایک نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے گا۔ میں نے ذیل کی سطور میں صرف ایک پہلو کو لیا ہے، یعنی مصحفی کے زمانے کی ادبی محفلیں، اور اُن کا معیار، اور میرے اصلی مآخذ مصحفی کے تذکرے ہی ہیں۔

اصل موضوع کی طرف رجوع کرنے سے قبل ایک بات اور عرض کر دوں جو مصحفی کے مآخذ سے متعلق ہے تاکہ ان کی مورخانہ حیثیت واضح ہو جائے۔

ہمارے تذکروں پر ایک عام اعتراض جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ ہے کہ اُن میں مآخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔ مصحفی کے سلسلے میں یہ اعتراض کلیتاً صحیح نہیں ہے۔ افسوس ہے انھوں نے میر کے تذکرہ نکات الشعرا کا حوالہ نہیں دیا۔ حالانکہ اُن کے تذکرے میر کے اسکول ہی سے متعلق ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ انھوں نے صرف میر حسن، گردیزی، اور قدرت اللہ شوق کے حوالے دیئے ہیں۔ ہاتف، ثبات، نکہت، اور ذکا کے بیان میں انھوں نے والہ داغستانی کے تذکرہ ریاض الشعرا کا ذکر کیا ہے۔ مردم دیدہ کا حوالہ انھوں نے حاکم کے بیان میں دیا ہے۔ اسی طرح آصف کے بیان میں انھوں نے آزاد کے "خزانۂ عامرہ" کا ذکر کیا ہے۔

اس گفتگو سے میرا مقصد یہ ہے کہ مصحفی نے نقل در نقل نہیں کی، انھوں نے حوالے دیئے ہیں۔ اور جس بات کی تحقیق نہیں ہوئی اس کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔ اُن کی رائیں بڑی حد

تک محققانہ، متوازن۔ اور معتدل ہیں۔ ان تذکروں پر ایک اور عام اعتراض یہ ہے کہ ان سے شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور نشیب و فراز کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن مصحفی نے اپنے زمانے کے ادبی رجحانات اور میلانات کی طرف جابجا اشارے کئے ہیں۔ جو ادبی رفتار کے سمجھنے میں بہت مفید ہیں۔

حاتم کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے کہ ولی کے دیوان کا دہلی آنا تاریخ کا اہم واقعہ ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء سے ہوا جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور اسے اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔

گویا ولی ایک تاریخی ضرورت بن کر دہلی آئے تھے۔ یہاں کے شاعر اس گھریلو زبان میں شعر کہنا تو چاہتے تھے لیکن اُن کے سامنے کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال نہیں تھی۔ مصحفی کے الفاظ یہ ہیں:۔

روزے پیش فقیر، شیخ حاتم نقل می کرد کہ

"درسنِ دوئم فردوس آرام گاہ، دیوانِ ولی در شاہجہاں آباد آمدہ واشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ باد و سہ کس کہ مرادناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعرِ ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ دادِ معنی یابی و تلاشِ مضمون تازہ می دادیم۔

ولی کا کلام "زبان اور خیالات کا وہ آخری نقطۂ ارتقا ہے جسے تاریخ عرصے سے طے کر رہی تھی۔" اُن کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ لوگ فارسی کو چھوڑ کر اردو میں لکھنے لگے:۔

"واشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ شاعر جو اردو میں لکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ریختہ کی طرف متوجہ ہو گئے حقیقت یہ ہے کہ تاریخی قوتیں ولی کے ساتھ تھیں۔ فارسی مغلوں کے زوال کے ساتھ زوال پذیر تھی اور اردو کا ستارہ عروج پر تھا۔

اردو اس وقت سیال حالت میں تھی۔ ابھی اس کے ادبی معیار قایم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جن لوگوں نے اس پر اپنے نام ثبت کر کے اس کا ایک معیار قایم کیا وہ فارسی شاعری ہی کے دل دادہ نہیں تھے بلکہ اُن کی ذہنیت، رجحانات، اور خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کئے تھے۔ اس لئے وہ شعرا نے

فارسی (اور خاص طور پہ متاخرین شعرائے فارسی) سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایہام جو اتفاق سے ہندوستان کا سبزۂ خودرو بھی تھا، اسی راستے سے اُن کے کلام میں داخل ہوا ہے۔

ایہام کی مثالیں، ولی، داؤد، سراج، عزلت، آبرو، مضمون، حاتم، ناجی اور یک رنگ وغیرہ کے یہاں بہ کثرت ملتی ہیں۔ ان سے اردو شاعری کو نقصان پہنچا اور وہ کیف و لذت سے محروم ہو گئی۔ لیکن جلد ہی اس کے خلاف ردِ عمل بھی شروع ہو گیا۔ اور یہ غیر فطری التزام و تصنع مردود ٹھہرا۔ حاتم، ایہام گوئی کے بڑے علم بردار تھے لیکن وہ ۱۷۵۵ء میں اپنے کلام کا انتخاب دیوان زادہ کے نام سے کرنے پر مجبور ہوئے جو دورِ اصلاح میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔: مصحفی لکھتے ہیں:۔

"حالا کہ در دورۂ ما، زبانِ ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ، مشارٌ الیہ ہم مرتبہ سخن تازہ گویاں فہمیدہ دیوانِ قدیم خود را از طاقِ دل افگندہ، دیوانِ جدید بہ زبانِ ریختہ گویانِ حال ترتیب دادہ و "دیوان زادہ" نامش گزاشتہ"

ایہام گوئی کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی اس میں اس دور کے تمام اکابر شعرا شریک تھے۔ مصحفی نے میرزا مظہرؒ کے متعلق لکھا ہے۔

"در ابتدائے شوقِ شعر کہ ہنوز از میر و میرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دورِ ایہام گویاں بود، اول کسے کہ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست"

ایہام کے متعلق خود مصحفی کی رائے یہ ہے "فقیر اشعارِ ایہام را دوست نمی دارد"

مصحفی نے دورِ ایہام گویاں اور دورِ اصلاح و ترقی کو، قدیم و جدید کے ناموں سے بھی یاد کیا ہے سکندر کے بیان میں لکھتے ہیں: "اکنوں ہم گاہ گاہ فکرِ شعر بطور قدیم و جدید می کند"

یہ اکابر شعرا جو اصلاح کے میدان میں گامزن تھے وہ فارسی پر فریفتہ تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ فارسی کے مطالب کو اردو کے لباس میں پیش کریں۔: مرزا مظہرؒ ہی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"در دورِ ایہام گویاں اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست" آگے چل کر ان کو "نقاشِ اول ریختہ" کہا ہے۔

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور سب لوگ نوعروسِ ریختہ ہی کے خط و خال پر مرنے لگے۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"رواجِ شعرِ فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است در ریختہ ہم فی زمانا بپایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ۔"

اس کے علاوہ مصحفی نے دو اور رجحانات کا بھی ذکر کیا ہے اول "تلاشِ مالمیانہ" اور دوسرا "مسلسل گوئی" و غزل در غزل گفتن"۔ یہ رجحانات میر اور جرأت کے یہاں موجود ہیں۔

مصحفی نے مرزا احسن علی احسن کے ذکر میں "احتیاطِ محاورہ" اور "صحت زبان" پر زور دیا ہے اور ان اجزا کو "قوتِ شاعری" میں شامل کیا ہے۔

مصحفی کا خیال یہ ہے کہ شاعری بغیر درویشی کے ممکن نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ولی سے اصغر گونڈوی تک اردو پر تصوف کا گہرا اثر رہا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

"والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رود۔"

مصحفی صرف الفاظ کے ہیر پھیر کو بلند شاعری نہیں سمجھتے انھوں نے "معنی تازہ" اور "خیال رسا" کو بھی اپنے تذکروں میں اہمیت دی ہے اور اس کو شاعری کا جزوِ اعظم سمجھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا خیال یہ بھی ہے کہ شعر گوئی کے لئے آسائشِ طبیعت اور فراغِ خاطر کی ضرورت ہے گویا اگر ایک صنّاع اور شاعر کو معاشی آسودگی حاصل نہیں ہے تو وہ ادب کی خدمت نہیں کر سکتا۔ حیران کے بیان میں لکھتے ہیں:

"از بسکہ اوقاتش صرف معاشِ دنیاداری شدہ دمی شود اکثر در مشاعرہ بہ ہنگام خواندن عذر کم مناسبتیٔ طبع بہ شعر کردہ، والحق کہ دروغ نباشد، چرا کہ ایں فن بے تعلقی بسیار می خواہد۔"

مصحفی شعر کی جمالیاتی بنیادوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اچھی اور بڑی شاعری بغیر تجربہ اور فکر کی مدد کے نہیں کہی جا سکتی۔ تاباں کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ اُن کا "نہال قامت رعنائی" لوگوں کے شیرازۂ جان سے تیار ہوا تھا اور رنگین کے یہاں جو رنگینی ہے اس کا راز یہ ہے کہ اُن کی طبیعت عشق باز تھی:

"چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہ ہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ

نظم کشیدہ ":

میر سوز کے متعلق لکھتے ہیں۔

"کمال ہائے ایں بزرگ ماورائے کمال شاعری و درویشی بسیار اند، چنانچہ در تیر اندازی و سواری اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمی شعر، و آداب صحبت ملوک و سلاطین، و ظرافت طبع، و خندہ روئی و مدامت بیشگی و تحقیق معاش و گفتن کلمۃ الخیر در حق دیگرے ..... نظیر خود ندارد"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھا اور بڑا شاعر "جامع جمیع علوم غریبہ" ہوتا تھا جیسا کہ میر درد کے کمال موسیقی، جولاں کی کمال تیر اندازی، حکیم کی کمال تاریخ دانی اور رضا کی طغرا نویسی سے ظاہر ہے۔ اور یہی کمال ان کے اندر استغنا اور بے پروائی بھی پیدا کر دیتا تھا۔

میر سوز کے حال میں لکھتے ہیں:

"در ایں ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصۂ شعراست نظیر خود ندارد"

اس زمانے میں مختلف طبقے گیسوئے اردو کی مشاطگی میں مصروف تھے۔ مصحفی نے معمار، آتش باز، حجام، سپاہی، قلندر، صوفی، امرا، و رؤسا سب ہی کا ذکر کیا ہے اور یہ سب ہی اردو کے شیدا و فریفتہ تھے مصحفی نے یہ بات صراحت سے لکھی ہے کہ اس وقت فارسی، مغلوں کے سیاسی زوال کے ساتھ انحطاط پذیر تھی اور اردو کا ستارہ عروج پر تھا۔ تاریخی قوتیں اس کے ساتھ تھیں۔ اور شعرائے فارسی شرفا کی زبان چھوڑ کر اس عوامی بولی کو منہ لگا رہے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"در ریختہ فی زمانہ بپایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ"

مرزا مغل سبقت ایرانی تھے لیکن اب فارسی کو چھوڑ کر اردو ہی میں شعر کہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"بہ مقتضائے موزونیٔ طبع، فکر شعر ہندی موافق رواج زمانہ کردہ"

مرزا زین العابدین نواب سالار جنگ کے فرزندوں میں تھے جن کے یہاں اٹھتے بیٹھتے فارسی ہی کا چرچا تھا لیکن اب یہ حال تھا کہ

"بہ سبب موزونیِ طبع، عشقِ شعر ہندی از طفولیت دامن گیر حال بود رفتہ رفتہ بہ سن ہفدہ سالگی. . . . . دیوانے ترتیب دادہ"

اردو کے فروغ میں مجالسِ سماع کو بھی خاص طور پر دخل ہے مصحفی نے عنایت اللہ کے بیان میں لکھا ہے:

"در مجلسِ سماع ہمیشہ در وجد و حال شریک یاران ست"

خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے:

"ہر ماہ بتاریخ دویم بر مزار پدر خود مجلسِ غنا ترتیب می داد، آں روز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضر مجلسِ او می شدند"

اِن محفلوں میں فارسی کے ساتھ اردو کی غزلیں بھی پڑھی جاتی تھیں اور وہ عوام کے دل میں گھر کرتی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ میلے ٹھیلے بھی تھے جہاں اردو کی عوامی شاعری کو پھلنے پھولنے کے پورے مواقع تھے۔ مقصود کے بیان میں لکھتے ہیں:"

"کلامِ واہیئش را در ہنگامہ ہا و میلہ ہا می خوانند خصوصاً در ایامِ ہولی"

اس زمانے میں مشاعروں اور مراختوں کی جیسی بہتات ہوئی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

مشاعروں کی موجودہ شکل ہندوستانی ہے اس کا اردو میں باقاعدہ رواج میر کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔ دلّی کے شاعروں نے باہم شعر کہنے کے لئے مجلسِ مراختہ قایم کی تھی، میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں: گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ ایں لفظ بر وزنِ مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود۔ غالباً اس زمانے کا سب سے قدیم مراختہ وہ ہے جو خانِ آرزو کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور جس میں سودا، میر، درد اور جرأت وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

مصحفی کے زمانے میں یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ اور بڑھ گیا انھوں نے حسب ذیل مقامات پر ان ادبی محفلوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) اکبر کے بیان میں لکھتے ہیں:

"دراں ایام کہ فقیر در شاہ جہاں آباد، طرح مشاعرہ انداختہ اوّل برائے اصلاح شعر رجوع بفقیر آوردہ بود"

(۲) جواںؔ کے بیان میں لکھتے ہیں:

"پیش ازیں روزہائے کہ در حضور مشاعرہ بود بموجب ارشادِ والا بسر انجام غزلہائے طرحی، سعئ بلیغ بکار بردہ۔"

(۳) حجامؔ کے متعلق لکھا ہے:

"در اکثر مشاعرہ ہا موجبِ تحسین و آفرین یاران بودہ۔"

(۴) لالہ بالمکندؔ حضورؔ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"روزے در شاہ جہاں آباد بخانہ لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود، غزل طرحئ میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف "اُور" بمعنی "طرف" تقرر داشت وازیں جہت بعضے فصحا در اخلافِ اُردو شمردہ پیروش نکردند۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرے صرف اردو کی تبلیغ ہی کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ ایک ایسا ادارہ بھی تھے جہاں زبان کا کھرا کھوٹا پرکھا جاتا تھا۔

(۵) حکیمؔ کے متعلق لکھا ہے: اکثر در مشاعرہ ہا می آمد۔

(۶) زارؔ کے بارے میں لکھا ہے: اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی داخلِ صحبت می شد

(۷) مرزا سلیمان شکوہؔ کے ترجمے میں لکھا ہے:

"درایامے کہ حکم ترتیبِ مجلسِ مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کاردانانِ ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند۔"

(۸) مصحفیؔ نے مشاعرۂ صاحبِ عالم کے علاوہ "مشاعرہ پسر راجہ رام ناتھ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت جب کہ مغلیہ سلطنت میں خاک اُڑ رہی تھی ادب کی محفلیں سونی نہیں ہوئی تھیں، اُن میں صوفی بھی شریک تھے اور سپاہی بھی، اور جب وہ باہم مل بیٹھتے تو غمِ روزگار

کو بھول جاتے تھے اور ایسے نامساعد حالات میں جب کہ ہر طرف افراتفری اور بدامنی تھی، ادب کی شمع کو اپنے دل کی گرمی اور تپش سے فروزاں رکھتے تھے۔

اردو کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ان محفلوں میں ہر طبقہ، ہر مذہب اور ہر عقیدہ کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شعر کہتی تھیں۔ ان میں طوائفیں بھی تھیں اور اس کے تاریخی اسباب تھے۔ اس زمانے میں عشق و محبت کے لوازم گھر کے بجائے بازار ہی میں نشو ونما پا سکتے تھے۔ بیوی صرف خاندان چلانے کا ذریعہ تھی اور طوائف جذباتی دنیا کی مالک، موخر الذکر کا درجہ سوسائٹی میں اتنا ذلیل نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔ لیکن مصحفی نے جہاں موتی بیگم طوائف کا ذکر کیا ہے وہاں گنا بیگم کا بھی جو عماد الملک کی بیوی تھی اور مختلف کمالات اور علوم سے بہرہ ور تھی۔ ادب اور سماج میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ خارجی مؤثرات ہی ادب کو رنگ روپ دیتے ہیں۔ مصحفی نے کہیں کہیں ان سماجی حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں "ان ایام بے تمیزی" اور افراتفری میں دستکار، صناع، وضیع و شریف، مزدور اور کسان سب ہی پریشان اور مضمحل تھے۔ خالصہ کی زمین کم ہو جانے سے خود شاہی خاندان پہ تین تین وقت کے فاقے گزرتے تھے اور سلاطین کی حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم پہ کپڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی: بقول مصحفی، یہ ہجو نہیں، حقیقت ہے:

جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر
یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کے بیاں ہے
لگ جائے زباں میری کروں ہجو گر اُن کی

جو امرا تھے اُن کے یہاں سے مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی: بقول مصحفی ؎

تن خواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں

انگریزوں کے معاشی مظالم کا حال یہ تھا کہ بنگال اُن کے قبضہ میں چلا گیا تھا اور اس کی وجہ سے گویا ہماری اقتصادی شہ رگ کٹ گئی تھی۔ یوں سمجھیے کہ اگر بنگال و کرناٹک کے خزانے انگلستان نہ پہنچتے تو ان کا صنعتی انقلاب ہرگز ہرگز فروغ نہ پاتا۔ مصحفی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

ان حالات میں امن وسکون کہاں ؟ ہر طرف لوٹ مار اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ بقول مصحفی

ع بس قلعے کے نیچے ہی ٹک اک امن واماں ہے

مفلسی تمام خرابیوں کی جڑ ہے، اس اقتصادی بدحالی اور معاشی اختلال کا اثر ہمیں اس زمانے کی جنسی محبت، سماجی زندگی اور ادبی روایات میں بھی نظر آتا ہے، مصحفی میر مہدی داغ کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"قدم در راہِ شاہد پرستی گزاشتہ، بر زنے اہلِ شوق وارفتہ بود، غافل ازیں کہ فراقِ ایں قوم فریبندہ اگر آدم را بہ کشتن دہد، سرِ موئے رحم بہ حالش نہ کنند . . . . خو کردۂ وصال تابِ جدائی نیاوردہ بر بسترِ بیماری افتاد۔ دریں اثنا خطے از مطلوب رسید، ایامِ وفاتش قریب رسیدہ بود کہ در خطِ جواب، ایں شعر حسبِ حالِ خود نوشتہ رواں کرد و بعد آں جانِ شیریں بہ جاناں سپرد۔ شعر ایں ست :

از جاں رمقے بود کہ مکتوبِ تو آمد دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

رسوا کے بیان میں لکھا ہے :

"چوں مومی الیہ بے شربِ شراب یک ساعت، آرام نمی یافت، میزبان روزے یک طفل را، برائے آوردنِ شراب بہ احمد نگر کہ محلہ، بیرونِ شہر واقع شدہ فرستاد، چوں آمدنش دیر کشید، بایشاں گفت کہ تا آید تا شراب آید، اندکے سیر باغ کنیم۔ بدیہہ از زبانش برآمدہ

لڑکا گیا شراب کو، کاہے کی سیر ہو ہم گزرے اس شراب سے لڑکے کی خیر ہو

مصحفی آگے چل کر لکھتے ہیں :

"در روایت دیگر چنیں است کہ بر جوہری پسرے کہ شیفتہ او گردیدہ سودا بہم رسانیدہ بود در سیرِ باغ از دستِ او بہ شمشیر کشتہ شدہ"

مصحفی میر کے متعلق لکھتے ہیں :